

## خاطرات

محمد عمار خان ناصر

# سیکولرزم یا نظریاتی ریاست: بحث کو بندگی سے نکالنے کی ضرورت

مذہبی ریاست یا سیکولرزم کی بحث ہمارے ہاں کی بہت بنیادی اور اہم نظریاتی بحثوں میں سے ہے جس پر سنجیدہ گفتگو اور تجزیے کی ضرورت ہے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ ابھی تک اس موضوع پر با معنی اور نتیجہ خیز مکالمہ "شروع نہیں ہو سکا۔ حقیقی مکالمے کا غاز کی شرط اولین اس نکتے کو تسلیم کرنا ہوتا ہے کہ دونوں فریقوں کے پاس اپنی بات کی قابل اعتمادی بنیادیں موجود ہیں جو مکالمے سے ایک دوسرے کو سمجھائی جا سکتی ہیں۔ اس بحث میں بھی دونوں فریقوں کے موقف کے کچھ پہلو اپنے داخلی میراث پر ایسے ہیں جن کا ابلاغ دوسرے فریق تک ہونا چاہیے اور جو مختلف موقف پر اثر انداز ہونے کی فکری صلاحیت بھی رکھتے ہیں، لیکن حقیقی مکالمہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ پہلو خط تصنیف کے اس پار پہنچ ہی نہیں پار ہے۔

سیکولرزم کے حادی دانش و رہوں میں سے دو تین نام ہی لیے جاسکتے ہیں جو اپنا مقدمہ سنجیدہ فکری بنیاد پر پیش کرتے ہیں، معروضیت کے ساتھ مختلف نقطہ نظر کو اس کی اپنی بنیادوں پر سمجھتے ہیں اور ان کے طرز استدلال میں طبقائی کشاکش، حریفانہ رد عمل اور منطقی مغالطوں کے اثرات بھی کافی کم دکھائی دیتے ہیں، مثلاً اکثر مبارک علی، محمود مرزا، خالد احمد اور ممتاز حیدر۔ (موزخانہ کری کی کتاب "تہذیبی نزگیت" کا مطالعہ، اختلاف کی پوری گنجائش کے باوجود مذہب اور لبرلز، دونوں کو کرنا چاہیے۔) تاہم اخبارات میں اس مکتب کی "عوامی" نمائندگی کرنے والے زیادہ تر حضرات کو فکری انہی پسندی اور اسلوب اظہار، دونوں کے لحاظ سے اپنے مکتب قرکے "ملا" ہی قرار دیا جاسکتا ہے جن کے طرز استدلال اور ذہنی اپروپریج کے باعث یہ بحث نتیجہ کے اعتبار سے "خود کلامی" سائے گے نہیں۔ بڑھ پاتی۔ مکالمہ وہ ہوتا ہے جس میں بھلے طزو تعریض ہو، لیکن استدلال کی جہت ایسی ہو کہ مخالف اس میں وزن محسوس کرے اور چاہے تسلیم نہ کرے، لیکن اس کے ہاں خاموش نظر ہانی کا عمل شروع ہو سکے۔

سنجیدہ مکالمہ شروع نہ ہو سکنے کی ایک بڑی وجہ اس بحث کو دیکھنے کا تناظر اور بحث کا نیادی مفروضہ ہے جو اتفاق سے بحث کے دونوں فریقوں میں مشترک ہے۔ دونوں فریق بنیادی طور پر اس بحث کو تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں، یعنی یہ کہ نئی ریاست کی تکمیل میں قائدانہ کردار ادا کرنے والی تاریخی شخصیت یا طبقات کا زاویہ نظر کیا تھا جبکہ دونوں طرف مسلم مفروضہ یہ ہے کہ ان تاریخی شخصیت یا طبقات کے زاویہ نظر سے ریاست کی نظریاتی حیثیت کا مسئلہ طے شدہ اور مسلمہ تھا جس سے بعد میں انحراف کی راہیں اختیار کرنے کی کوشش کی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے ریاستی کردار کے حوالے سے تقسیم سے پہلے ہی بہت واضح فکری تقسیم موجود

تحقیقی اور ہر فریق نئی ریاست میں اپنے تصورات کے روپہ عمل ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ تقسیم کے بعد، اس کشکش میں مذہبی قوتوں کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ مخالف فکری قوتیں اور ان کے ادکار عملاً یا اصولاً کا عدم ہو گئے ہیں، بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اس حقیقت کا اور اک ہمارے ہاں کے سب سے بڑے مذہبی سیاسی مفکر مولانا مودودی نے خود بھی کیا تھا اور اسلامی جدوجہد کے کارکنان کو بھی بڑے واضح طریقے سے یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مولانا نے لکھا کہ:

”ہم جس ملک اور جس آبادی میں بھی ایک قائم شدہ نظام کو تبدیل کر کے دوسرا نظام قائم کرنے کی کوشش کریں گے، وہاں ایسا خلاہ ہم کو بھی نہ ملے گا کہ ہم بس اطمینان سے ”براہ راست“ اپنے مقصد کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔ لامحالہ اس ملک کی کوئی تاریخ نہ ہوگی، اس آبادی کی مجموعی طور پر اور اس کے مختلف عناصر کی افرادی طور پر کچھ روایات ہوں گی۔ کوئی ذہنی اور اخلاقی اور نفیسی فضنا بھی وہاں موجود ہوگی۔ ہماری طرح کچھ دوسرے دماغ اور دوست و پا بھی وہاں پائے جاتے ہوں گے جو کسی اور طرح سوچنے والے اور کسی اور راستے کی طرف اس ملک اور آبادی کو لے چلنے کی سعی کرنے والے ہوں گے.... ان حالات میں نہ تو اس امر کا کوئی امکان ہے کہ ہم کہیں اور سے پوری تیدی کر کے آئیں اور یہ کیا ایک اس نظام کو بدل ڈالیں جو ملک کے ماننی اور حال میں اپنی گہری جڑیں رکھتا ہے، نہ یہ ممکن ہے کہ اسی ماحول میں رہ کر کشکش کیے بغیر کہیں الگ بیٹھے ہوئے اتنی تیاری کر لیں کہ میدان مقابلہ میں اڑتے ہی سیدھے منزل مقصد پر پہنچ جائیں اور نہ اس بات ہی کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ ہم اس کشکش میں سے گزرتے ہوئے کسی طرح ”براہ راست“ اپنے مقصد تک جا پہنچیں۔ (”مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کا طریقہ فکر“)

مرتب: محمد ریاض درانی، جمعیۃ پبلی کیشنر، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۶، ۱۱۷ (۱۱۷)

اسلامی ریاست کی جدوجہد کو تاریخی تفاظر میں واضح کرتے ہوئے مولانا مودودی نے لکھا:

”واقعات کی دنیا میں ہم جس صورت حال سے دوچار ہیں، وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں مجلس قانون ساز کے قیام کی ابتداء انگریزوں کے دور حکومت میں ہوئی۔ اس نظام کو انہوں نے اپنے نظریات کے مطابق قوی، جمہوری، لاوینی ریاست کے اصولوں پر قائم کیا۔ انھی اصولوں پر سالہا سال تک اس کا مسلسل ارتقا ہوتا رہا اور انھی اصولوں پر نہ صرف پوری ریاست کا نظام تعمیر ہوا، بلکہ نظام تعلیم نے ان کو پوری طرح اپنالیا اور بھیت مجموعی سارے معاشرے نے ان کے ساتھ مطابقت پیدا کر لی۔ ان واقعات کی موجودگی میں جتنے کچھ ذرا تائی ہمارے (یعنی دینی نظام کے حامیوں کے) پاس تھے، ان کو دیکھتے ہوئے یہ بھی کوئی آسان کام نہ تھا کہ کم از کم کمینی حیثیت سے اس عمارت کی اصل کا فرمانہ بنیاد (لاوینیت) کو بدلاوا کر اس کی جگہ وہ بنیاد رکھ دی گئی جس کی بنابر آپ موجودہ دستور کو نیم دینی تسلیم کر رہے ہیں۔“ (ایضاً، ص ۱۲۱، ۱۲۲)

ان میں سے دوسرے اقتباس کو بطور خاص دیکھیں تو واضح ہو گا کہ ایک قائم شدہ نظام سے انحراف، لاوینی عناصر نے نہیں کیا، کیونکہ اس نظام کے ساتھ تو معاشرے کے سارے عناصر نے مطابقت پیدا کر لی تھی۔ اصل

میں اس طرز سیاست میں تبدیلی لانے کی جدوجہد دینی عناصر کر رہے تھے جس میں انھیں سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ ایسی صورت میں اس اخلاقی سیاسی بحث کو اس طرح دیکھنا جیسے مذہبی روایت میں مبتدعانہ افکار کو دیکھنا جاتا ہے، غیر حقیقی اور غیر واقعی انداز فکر ہے۔

اس انداز فکر کے زیر اثر بعض دفعہ مذہبی اہل دانش کی طرف سے اس طرح کے پیانات دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ریاست کی نظریاتی حیثیت پر کسی کو سوال اٹھانے کی اجازت نہیں ہوئی چاہیے، کیونکہ یہ ایک بنیادی اور اساسی معاملہ ہے جو طے شدہ ہے اور ایسے امور کو چھیڑنے کی اجازت کوئی ریاست یا معاشرہ نہیں دیتا۔ یہ بات ایک تو اس لحاظ سے درست نہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ یہاں اسلامی یا سیکولر ریاست کی بحث پہلے دن سے موجود ہے اور آئینی طور پر فیصلہ ہو جانے کے باوجود نظری طور پر اب تک یہ بحث جاری ہے اور نظری بحث کے علاوہ آئین کی تعمیر کے حوالے سے اعلیٰ عدالتوں میں یہ بحث موجود ہے کہ کیا شریعت کی بالادستی کی صفات دینے والی شفیع فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں یا ان کی حیثیت آئین کی دوسری شفتوں کے برابر ہے، یعنی تضاد کی صورت میں شریعت کو بالادست حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔

دوسرے یہ کہ کسی بھی اجتماعی فیصلے کی قوت اسی میں مضمرا ہوتی ہے کہ اس کی فکری و نظریاتی اساسات کا وزن لوگوں پر واضح رہے اور اس حوالے سے سوالات یا شہادت اٹھ رہے ہوں تو ان کا نظریاتی دلائل کے ساتھ ہی ازالہ کیا جائے۔ جو فیصلہ کیا گیا، اگر وہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہے تو سوالات سے نہیں گھبرا انا چاہیے، بلکہ سوالات کو روکنے کی کوشش کرنا بسا اوقات منفی نتائج کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ جو سوالات واقعہ ذہنوں میں موجود ہوں، انھیں کسی طرح کے قانونی یا معاشرتی دباؤ سے زیادہ دیر تک دبائے رکھنا ممکن بھی نہیں ہوتا اور ایسا کرنا حکمت اور دانش کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ فیصلے کا دفاع کھلے بحث و مباحثہ میں اس کے اپنے میراث کی روشنی میں کیا جائے اور سوالات کی کمزوری کو دلیل ہی کے میدان میں واضح کیا جائے۔

اب دوسری طرف ایک نظر ڈالیے:

لبرل حلقے کی طرف سے سیکولرزم کے حق میں مضبوط ترین دلیل قائد اعظم کی گیارہ اگست کی تقریر ہے جو بحث کے تاریخی تناظر کو فیصلہ کرنے سمجھنے کے ذہنی رویے کا انہصار ہے۔ تاہم لبرل مکتبہ فکر کو اس استدلال کی کمزوریوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مثلاً قائد اعظم گیارہ اگست کو دستور ساز اسمبلی کے سامنے اپنی تقریر میں جو کچھ کہہ رہے تھے (اس کی جو بھی تعبیر کی جائے، سر دست اس سے بحث نہیں)، اس کی حیثیت راہ نما مشورے یا تجویز کی تھی یا دستور ساز اسمبلی کو ڈکٹیشن کی؟ اگر وہ ڈکٹیشن دے رہے تھے تو اپنے اکرہ اختیار سے صریحًا جاؤز فرمادیاں تھیں زیب نہیں دیتا تھا۔ اور اگر ان کے ارشادات کی حیثیت راہ نما مشورے کی تھی تو انہوں نے دیانت داری سے جو مشورہ بہتر سمجھا، دے دیا، لیکن دستور ساز ادارے نے بحد احترام اسے قبول نہیں کیا۔ خود قائد اعظم نے تحریک پاکستان کے دوران میں دستور پاکستان کی نوعیت اور نظریاتی نتیجے کے حوالے سے بنیادی ذمہ داری دستور ساز اسمبلی کی بیان کی تھی اور یہ بات گیارہ اگست کی تقریر کے بھی بعد فروری ۱۹۴۸ء میں امریکی عوام

کے نام جاری کردہ ایک ریڈ یو پیغام میں کہی گئی تھی جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بانی پاکستان اپنا کوئی نظریہ اسمبلی پر مسلط نہیں کر رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا:

”پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی دستور بنانا ہے۔ مجھے علم نہیں کہ اس کی حقیقی شکل و صورت کیا ہو گی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ پاکستان کا آئین جمہوری قسم کا ہو گا جسے اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق تشكیل دیا جائے گا۔ اسلام کے اصول آج بھی عملی زندگی پر اسی طرح لا گو ہوتے ہیں جس طرح تیرہ سو سال قبل ہوتے تھے۔ اسلام نے ہمیں جمہوریت سکھائی ہے اور مساوات اور انصاف کا سبق دیا ہے۔ ہم ان شان دار روایات کے امین اور وارث ہیں اور دستور سازی میں انھی سے راہنمائی حاصل کی جائے گی۔ بہر حال پاکستان ایک تھیو کریٹ (مذہبی) ریاست نہیں ہو گی اور یہاں تمام اقیانیوں، ہندو، عیسائی، پارسی کو بحیثیت شہری وہی حقوق حاصل ہوں گے جو دوسرے شہریوں کو حاصل ہوں گے۔“

اقتباس سے واضح ہے کہ قائد اعظم کے ذہن میں کسی لامذہ ہی لعنی سیکولر ریاست کا تصور نہیں، البتہ وہ ”مذہبی ریاست“ کے اس تصور کو قطعاً قبول کرنے کے لیے تیار نہیں جس میں شہریت دراصل کسی خاص مذہب کے مانے والوں کی ہوتی ہے، جبکہ مذہبی اقیانیوں کو دوسرے درجے کا شہری تصور کیا جاتا اور مساوی سیاسی حقوق کا حق دار نہیں سمجھا جاتا۔

اسی نوعیت کا ایک اور اعتراض یہ ہے کہ تحریک پاکستان میں شامل مذہبی طبقے سیاسی طور پر تو قائد اعظم کی قیادتہ صلاحیتوں کے قائل تھے، لیکن نئی ریاست کیسی ہونی چاہیے، اس کے متعلق قائد اعظم کے وزن کو قبول نہیں کرتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ یا خر کس اصول کی رو سے اعتراض بنتا ہے؟ یہ سامنے کی بات ہے کہ تحریک پاکستان میں شامل مختلف طبقوں کے اپنے اپنے تصورات اور مقاصد تھے۔ تحریک میں شرکت صرف اس لکھتے کے حوالے سے تھی کہ مسلمانوں کا ایک الگ ملک ہونا چاہیے۔ اگر اس سے یہ لازم آتا ہے کہ قیام وطن کے بعد کے اہداف میں بھی سب کا انتقال ہونا چاہیے تو یہی اعتراض پلٹ کر خود قائد اعظم پر بھی وارد ہوتا ہے۔ کیا انھیں نہیں معلوم تھا کہ مذہبی علم و مسئلہ کس جزے اور تصور کے تحت تحریک کا حصہ بننے ہیں؟ پھر بھی انھوں نے مشترک مقصد کے حصول کے لیے انھیں ساتھ رکھا اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ بعض تجزیہ نگاران کی اس حکمت عملی کی یہ تعبیر بھی کرتے ہیں کہ انھوں نے حصول مقصد سے پہلے اپنی پوزیشن گول مول رکھی۔ عملکرکے سامنے ان کی پسند کی باتیں کیں اور دوسری جگہوں پر اپنی پسند کی، لیکن ملک بن جانے کے بعد اپنا صل تصور گیارہ اگست کی تقریر میں واضح کر دیا۔ اگر قائد اعظم کے طرز سیاست کی یہ تعبیر درست ہے تو اخلاقی لعلت سے ان کی حیثیت مذہبی طبقے سے بہتر نہیں، بلکہ تم تری ہتھی ہے، کیونکہ علم تو شروع سے آخریک اپنے موقف میں واضح تھے اور قیام وطن کے بعد بھی انھوں نے وہی بات کہی جو پہلے سے کہتے چلا رہے تھے۔ غالباً انھی وجوہ سے ڈاکٹر مبدک علی نے ایک اٹر دیو میں قائد اعظم کے زاویہ نظر پر ارتکذ کرنے والے اس رائج اور مقبول استدلال کی کمزوری تسلیم کی اور کہا کہ ہمیں سیکولر ریاست کا پیش پر خود اس تصور ریاست کی افادیت نیز اپنے سابقہ تجربات کے حوالے سے غور کرنا چاہیے۔

بحث کے تاریخی پہلووں پر ارتکاز کے علاوہ فریقین کے انداز استدلال میں "برح شخصیت" بھی ایک غالب عصر کی حیثیت سے موجود رہا ہے جو منطقی مغالطے کی ایک صورت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فسادیں کی تکمیلی پر بات کرنے کے بجائے، دلیل یا موقف پیش کرنے والے کی نیت اور کردار وغیرہ کی خرابی نمایاں کی جائے اور اس سے یہ تاثر پیدا کیا جائے کہ چونکہ کہنے والا ایسا اور ایسا ہے، اس لیے اس کی بات غلط ہے۔

مذہبی اور سیاسی اختلاف رائے میں اس مغالطے کا استعمال ہمارے ہاں ایک معمول کی بات رہی ہے۔ تقسیم ہند کے موقع پر قوم پرستوں اور مسلم لیگیوں نے ایک دوسرے کے خلاف بڑھ چڑھ کر اس طرز استدلال کے نمونے پیش کیے۔ مسلم لیگیوں نے جمیع علماء ہند اور کانگریس کے زعماء کی کردار کشی اور تحریر و توہین میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور جمیع علماء کے حضرات نے یہی سلوک مسلم لگی قیادت کے ساتھ کیا۔ پاکستان بن جانے کے بعد بیان اہل منہب اور لبرلر کی کشمکش شروع ہو گئی اور مذکورہ طرز استدلال نے اس بحث میں بھی نمایاں جگہ پائی۔ مثلاً بالکل ابتدائی دور میں ہی جن مذہبی شخصیات (مولانا شیبیر احمد عثمانی اور مولانا مودودی وغیرہ) نے سیکولر ریاست کے مقدمے کے خلاف آئینی جنگ یتینے میں نمایادی کردار ادا کیا، وہ آج تک لبرلر کی نظر میں ناقابل معافی اور مطعون ہیں اور ان کی شخصیت یا جدوجہد کے مختلف پہلووں کو بہف بنا کر یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ چونکہ قرارداد مقاصد ان حضرات نے پیش کی تھی، اس لیے وہ غلط تھی۔ اتفاق سے مسلم لگی قیادت، خاص طور پر قائد اعظم کے متعلق یہی طرز استدلال ان کے قوم پرست مخالفین اختیار کرتے تھے۔

ان گزارشات کا حاصل یہ ہے کہ سیکولر ریاست کے مویدین اور مذہبی ریاست کے حامیوں، دونوں کو اپنے بیانیے کی تشكیل نو کی ضرورت ہے۔ جیسے سیکولر ریاست اسی پر انے بیانیے کو نئی بوتل میں پیش کر کے نئی نسل کو زیادہ ممتاز نہیں کر سکتے، اسی طرح مذہبی بیانیے بھی اپنے مقدمات اور استدلال کو از سر نو مرتب کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سابقہ بیانیے سے تاریخی طور پر کلی انتظام ظاہر ہے کہ ممکن نہیں، لیکن بحث کو ہمیشہ کے لیے تاریخ کے ایک مرحلے کے ساتھ مقید بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ تحریک پاکستان کے مختلف کرداروں کا تصور اور عملی کردار کیا تھا، اس سوال کو بتدریج بحث کے "تاریخی" گوشے تک محدود کر دینا ضروری ہے۔ آج کی نسل کو، سوالات کو ان کے اپنے میراث پر ڈسکس کرنے کی جرأت کرنی ہو گی۔ دونوں طرف کے نوجوان ذہنوں کو بات اس سے آگے بڑھانی چاہیے جہاں تک ان کے بڑوں نے پہنچائی ہے۔